دستنبو

خواجہ احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

دستنبو

مترجم

خواجہ احمد فاروقی

[redacted]

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ [redacted]10025

پہلی اشاعت	:	1994
دوسری طباعت	:	2011
تعداد	:	550
قیمت	:	[redacted] روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	721

Dastanbouy

by

Asad-Ullah Khan Ghalib

Translated By: Prof. K. Ahmad Faruqi

ISBN :978-81-7587-720-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی-6
اس کتاب کی چھپائی میں (70GSM, TNPL Maplitho(Top کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ دانشوروں، بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

Scanned by CamScanner

میں اس کتاب کا آغاز کرتا ہوں اس خدا کے
نام سے، جو طاقت بخشنے والا ہے، جو چاند، سورج اور
دن رات کا خالق ہے

دیباچہ

عظیم طاقت کا مالک ہے وہ شہنشاہ جس نے نو آسمانوں کو بلند کیا اور سات ستاروں کو روشنی عطا کی۔ بڑا صاحبِ علم ہے وہ خدا جس نے جسم کو روح سے سرفراز کیا اور انسان کو حکمت وانصاف (کی دولت) بخشی۔ جس نے مادے اور وسائل کی مدد کے بغیر سات (زمینوں) اور نو (آسمانوں) کو پیدا کیا۔ مشکل اور آسان کاموں کا بن جانا، (اس سلسلے میں راستے کی) معمولی یا غیر معمولی رکاوٹوں کا دور ہونا (ان سب امور کو) ان کی رفتار واثرات سے متعلق کیا۔

(خدا نے) ان ضابطوں کو اس طرح مرتب نہیں کیا ہے کہ یہ اجرام جو باہم متضاد ہیں (مختلف صفات رکھتے ہیں) ایک دوسرے سے دور دور رہتے

ہیں، اور (کبھی) ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، طاقت کے باوجود فرمان برداری نہ کریں اور قوت کار فرمائی اور صلاحیت تاثیر کے باوصف فرمانِ (قدرت) کے تابع نہ ہوں۔ ؎

تم آسمانوں اور ستاروں کے راز (جاننے) کا کیا دعویٰ کرتے ہو۔ تم تو ابھی
تک چت اور پٹ کے فرق سے واقف نہیں ہو۔ ستاروں کی پرستش نہ کرو
(ان کو دنیا کے کاموں میں مطلق صاحبِ اختیار نہ مانو) کیونکہ ایک آفتاب
(خدا) بھی موجود ہے۔ جس کی روشنی (کائنات کی تمام) ظاہر و پوشیدہ
چیزوں کو حلقے میں لیے ہوئے ہے۔

اگر زہرہ و مشتری میں (سعد ہونے کے لحاظ سے) فائدہ پہنچانے کی کچھ صلاحیت ہے (تو ہو) اور زحل و مریخ میں (نحس ہونے کے اعتبار سے) نقصان رسانی کی خاصیت ہے تو ہوا کرے۔ جو لوگ واقفِ حقیقت ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نحوست و برکت، اور مسرت و غم، کا سرچشمہ کہاں ہے۔ ستارے ایک عادل شہنشاہ کے ملازم ہیں (اس) عدالت، کے سپاہی کبھی حلقۂ انصاف سے قدم باہر نہیں نکالتے ہیں۔ مل جل کر کام کرنے اور کارسازی (تعمیلِ حکم) کے علاوہ ان کو کسی چیز سے تعلق نہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے سخت گیری کے (وسیلے سے) الجھے ہوئے کاموں کو سلجھانا چاہا۔ یا کسی نے نرمی کے (ذریعے) سے ہنگامۂ (زندگی) کی رونق افزائی کی۔ تو یہ سب

(زندگی کو) بنانے سنوارنے، (اور مشکلوں کو حل کرنے) کے مختلف انداز ہیں۔ ظلم یا بے نیازی نہیں۔ سہ

مغنی ساز کے تاروں پر مضراب سے ضرب لگاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ مسرتیں مصیبتوں کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔ دھوبی غصے میں آکر کپڑے کو پتھر پر نہیں مارتا۔

درحقیقت کسی چیز کا فنا ہونا کسی دوسری چیز کے وجود کا سبب بنتا ہے حقیقتہً آرام و تکلیف اور بلندی و پستی ساری چیزیں (خدا کی طرف سے) انسان کو ملتی ہیں۔ اس لیے وہ سب فائدے اور بہبودی کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ اور ان سے مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ دولت مند کسی محتاج کو چند پیسے دے یا ہزاروں روپے، ریشم کے تھان عطا کرے یا کمبل (ہر صورت میں) سخاوت اور درویش پروری ہے۔ قدرت کے عطیات کو اچھائی، بُرائی کے خانوں میں تقسیم کرنا یا کمی بیشی (کا الزام رکھنا) کج خیالی و کم فہمی ہے۔ یہ دنیا کی بے حقیقت چیزیں۔ جو (فنا کے طاقت ور تھپیڑوں کے) سامنے ہیچ ہیں۔ کیا ان کے لیے یہ بخشش (خداوندی) کچھ کم ہے کہ وہ موجود ہیں۔

لیکن یہ (دقیق) باتیں کم نظر اور کم معرفت لوگوں کی رسائی ذہن سے باہر ہیں اور اظہار بیان کی وہ طاقت بھی ختم ہو گئی۔ مجبوراً میں چند سیڑھیاں نیچے اترتا ہوں (آسان انداز بیان اختیار کرتا ہوں اور) انھیں کہی ہوئی

باتوں کو صاف اور سادہ انداز میں کہتا ہوں۔ آسمان کی گردش چکی کی رفتار کی مانند ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چکی کو چلانے والا ضرور ہوتا ہے۔ پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ آسمان کو گردش میں رکھنے والا بھی کوئی ہے۔ آسمان کے چرخے میں ستاروں کی صلاحیتِ نفع رسانی و اذیت دہی کے تاروں سے بنی ہوئی پونی لگی ہے۔ جس سے چند پردے تیار کر کے اہلِ دنیا کی نگاہوں کے سامنے ڈال دیے گئے ہیں۔ صاحبانِ معرفت اور واقفانِ اسرار ان پردوں کے باوجود دیکھ لیتے ہیں کہ ہر کام کا کرنے والا خدا ہی ہے۔ ؎

جب یہ مسلّم ہے کہ آسمان کی گردش علمِ خدا کے تابع ہے تو پھر آسمان جو کچھ دے

ہم اس کو ظلم کیسے کہہ سکتے ہیں۔

سبحان اللہ! کتنا عظیم ہے وہ خدا جو وجود عطا کرتا ہے اور عدم کو ختم کرتا ہے جو ظلم کو ختم کرنے والا اور انصاف کی روشنی کو پھیلانے والا ہے۔ وہ انصاف (کی طاقت) سے طاقتوروں کا زور گھٹا دیتا ہے اور اپنے کرم سے کمزوروں کو طاقت بخشتا ہے۔ ابابیل کے کنکروں کی ضرب سے فیل سوار خود سروں کا خاک میں مل جانا، یا ایک مچھر کا نمرود کو موت کے بستر پر سلا دینا کیا تھا؟ یقیناً یہ وہ نشانیاں ہیں جن سے اس کی (بے پناہ) قوت و قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ مجھ کو بتاؤ کہ یہ دو مختلف قسم کی تباہیاں جو مختلف زمانوں میں نازل ہوئیں، یہ کس ستارے کی نگاہ ستم کا کرشمہ تھیں۔ ؎

ضحاک جمشید سے تخت و تاج چھین لیتا ہے۔ سکندر دارا کا سینہ چاک کر دیتا ہے۔ عفریت حضرت سلیمان کے ہاتھ سے انگوٹھی اڑا لے جاتا ہے۔ جو دیو اور پریوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ تم جزا و سزا کے اسرار سے واقف نہیں ہو۔ بس آسمانوں اور ستاروں کو ہر چیز کا ذمے دار سمجھتے ہو۔

خدا جس طرح کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اسی طرح ہر موجود کو فنا بھی کر سکتا ہے۔ وہ خالق جس نے ایک لفظ کن سے سارے عالم کو پیدا کیا اگر وہ اس عالم کو فنا کر دے تو کس کی مجال ہے کہ چوں وچرا کر سکے۔

تمہید

اس زمانے میں ہر راگ کا آہنگ اور ہر چیز کا قاعدہ ہی بدل گیا۔ سپاہی سرداروں سے منحرف ہو گئے۔ سخن طرازی سے کیا فائدہ، کہنا چاہیے کہ زمانہ ہی بدل گیا۔ منجمین کا خیال ہے کہ جس زمانے میں ایران کے آخری شہنشاہ یزدجرد کی محفلِ عیش عربوں کے حملوں سے درہم برہم ہو گئی تھی۔ اس وقت زحل و مریخ دونوں برج سرطان میں جمع تھے۔ آج کل بھی برج سرطان زحل و مریخ کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ بغاوت، لڑائی، ظلم، خوں ریزی اور ذلت اسی (قرانِ نحس کے) اثرات ہیں (لیکن) جو لوگ شناسائے حقیقت ہیں۔ وہ اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ ایران پر عرب کا حملہ (بالکل دوسری چیز تھی۔ وہ) تو ایک ملک پر دوسرے ملک کے لوگوں کی فوج کشی تھی۔ لیکن یہاں تو فوج نے اپنے سرداروں سے بغاوت کی ہے۔ ایران کی قدیم داستانوں سے ان دو لڑائیوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

جنگ عرب و ایران اور غدر کا مقابلہ

ایران پر (عرب کا) حملہ مذہبی بنیاد پر تھا۔ ایران جو علم و حکمت کے لحاظ سے ویران ہو چکا تھا، ایک نئے مذہب کی برکتوں سے معمور ہو گیا اور اس کی بدولت آگ کی (پرستش اور) غلامی سے نجات پائی۔ لیکن (ہندوستان میں) جہاں سوال صرف قانون کا ہے، ہندوستان والے کس نئے آئین کا سہارا لے کر (اپنے اس فعل پر) خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں۔

اہلِ ایران نے آتش پرستی سے منہ موڑ کر خدا پرستی کا راستہ دیکھا۔ لیکن ہندوستان والے منصف حاکموں (انگریزوں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر درندہ صفت انسانوں کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ تم نہیں دیکھتے ہو کہ دامن و دام اور داد و دد میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ کسی دوسری حکومت میں انصاف کی امید رکھنا بالکل نادانی ہے۔ عربوں کے تازیانے سے جو زخم لگے تھے وہ مبارک مذہب (اسلام) ان زخموں کا مرہم بن گیا تھا۔ اگر ان مصیبتوں کے بعد زمانہ امن و راحت کی دولت بخشتا، تو مصیبت زدہ

غم و آلام بھول سکتے تھے۔ اگر کسی واقفِ راز و صاحبِ نظر کے خیال میں اس قیامت کے بعد کوئی راحت ملنے والی ہو تو بتائے اور میرے غمگین اور خوفزدہ دل کو تسکین بخش کر ممنون کرے (امن و انتظام کے ذمہ دار) ملازمین حاکموں سے بغاوت کریں۔ سپاہی افسروں کو قتل کریں اور خوشیاں منائیں۔ اور ان کو ذرا بھی پشیمانی نہ ہو۔

اے واقفانِ اسرار و عارفانِ سود و زیاں یہ سارا ہنگامہ خدا کا قہر ہے ایران کی وہ جنگ اس قدر مایوس کن اور تباہ کار نہیں تھی۔ ؎

سارے پریشان نغمے اس لیے بلند ہو رہے ہیں کہ عالمِ اضطراب میں مضراب سے تاروں کو بے طرح چھیڑ رہا ہوں۔

میں اس قدر نافہم نہیں ہوں کہ ستاروں کو روشن ہونے کے باوجود بے نور کہہ دوں۔ آسمان کو عظیم و بلند ہونے کے باوصف بے سر و ساماں سمجھوں، مخلوقِ آسمانی کی کارگذاریوں کو جھوٹ سمجھوں۔ یا ان دو منحوس ستاروں (زحل و مریخ) کے ایک برج میں جمع ہونے سے آج بھی انھیں پُر آلام حالات کی توقع کروں، جو اب سے ایک ہزار سال پہلے (جنگ عرب و ایران کے زمانے میں) واقع ہوئے تھے۔

میں جو زمانے کے ہاتھوں ناقابلِ علاج مصیبتوں میں گرفتار ہوں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس زمین پر بسنے والے جنھوں نے برج سرطان کو

نہیں دیکھا ہے اور جو زحل و مریخ کے نام سے ہی واقف ہیں۔ ناشنیدہ اور ان دیکھی باتوں میں نہ الجھیں بلکہ یہ سمجھ لیں کہ زمانے نے جس کے سینے میں ماضی و مستقبل کے راز محفوظ ہیں اور اچھے لوگوں کے کام کو بگاڑنا اس کی پرانی عادت ہے۔ اس امر کو روا نہ رکھا کہ غیر فوج کی دست برد سے دانایانِ فرنگ کو نقصان پہنچائے بلکہ اس نے اس گروہ (انگریز) پر اسی کی ہر جانب سے آنے والی افواج کو مسلط کر دیا۔

اس کتاب کے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ میں نے جس کی قلم کی جنبش سے کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھر جاتے ہیں۔ انگریزی حکومت کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن سے ان فاتحینِ عالم کے دستر خوان سے ریزہ چیں ہوں۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہ دہلی نے مجھے بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں۔ جس کے عوض ۶۰۰ روپیہ سالانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے استاد کا انتقال ہو گیا اور اصلاح شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کر دیا گیا۔

ملازمتِ قلعہ کا ذکر

میں بوڑھا اور کمزور تھا۔ نیز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے

کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بار خاطر حاضرین ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو کچھ دیر حاضرِ خدمت رہتا تھا ورنہ دیوانِ خاص میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا۔

اس مدت میں جتنا کام مکمل ہو جاتا۔ اس کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا تھا۔ یہ تھا میرا تعلق اور میرا کام۔ لیکن یہ تیز رفتار آسمان اس خیال میں محو تھا کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور میرے اس سکون و آرام کو جس میں آسایش و فراغت کا کوئی حصہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھا، تباہ کر دے۔ ؎

(یہ آسمان ایسا ظالم ہے) کہ دشمن ہو یا دوست ہر ایک اس کی تیغِ
بے پروائی سے زخمی رہتا ہے۔

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء

اس سال جس کا مادۂ تاریخی بہ رعایتِ تخرجہ "رستخیزِ بے جا" ہے اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں۔

جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ۱۰ مئی کے دن، جو بہت منحوس تھا، میرٹھ کی فوج کے کچھ بدتصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد، اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہو گئی ہو شہر کی حفاظت کی ذمہ داری اور حق نمک ہر چیز کو بھول گئے۔ ان بن بُلائے یا مدعو کردہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھُلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں۔ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے۔ جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا ادھر سے رُخ نہیں پھیرا۔

کچھ مسکین گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسّر تھا۔ شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دُور زندگی کے دن گزار رہے تھے (ایسے مسکین و صلح پسند)۔ جو تیر و تبر کے فرق سے ناواقف تھے اور اندھیری راتوں میں چوروں کے شور و غل سے ڈر جاتے تھے جن کے ہاتھ تیر و تلوار سے خالی تھے۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے اور

شہر کے ہر حصے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں، جو لڑائی کے ارادے سے کمر کس کر تیار ہو سکیں۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند اور خیر خواہ شہر کے ہر حصے اور ہر گلی کوچے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز بہنے والے پانی کو خس و خاشاک سے نہیں روکا جا سکتا۔ اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غم گین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔

مجبوری و خانہ نشینی

انہیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سنا۔ چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اعداء دین، قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گل اندامُوں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔

انگریزوں کے قتل پر اظہار افسوس

افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے، خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خواتین جن کے

چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن بھی چاند کی طرح دمکتے تھے!
حیف وہ بچے جنھوں نے ابھی دنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن
کے ہنس مکھ چہرے گلاب ولالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش
رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب
ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔

(فنا کی) چنگاریاں برسانے والی وہ موت، شعلے جس کا سرمایہ ہیں۔ جس
کے ہاتھوں لوگ غم زدہ رہتے ہیں اور ماتمی لباس پہننے پر مجبور ہوجاتے ہیں
اگر ان مقتولین کے سرہانے آہ وزاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہوجائے
تو روا ہے۔ اگر آسمان (اس غم میں) غبار کی طرح منتشر ہوجائے اور زمین
گردباد کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دے تو بجا ہے۔ ؎

اے موسمِ بہار! بسمل کی طرح خاک وخون میں مل جا۔ اے زمانے!
اندھیری رات کی طرح تاریک ہوجا۔ اے آفتاب (اس غم میں) اپنے
رخساروں کو (پیٹ کر) نیلا کرلے۔ اور اے چاند (غمگین) زمانے کے دل
کا داغ بن جا۔

خدا خدا کرکے وہ منحوس دن ختم ہوا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان
سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جابجا پڑاؤ ڈالا۔ اندرونِ قلعہ
شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمنِ سلطانی کو خواب گاہ۔ رفتہ رفتہ

دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے۔ (اور نمک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے) گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمین دار، سب یک دل ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اور پھر کیسی مضبوطی سے کمریں کسی تھیں کہ صرف اس دریا کے خون کی موجیں ہی ان کو کھول سکتی تھیں، جو کمروں سے گزر جائے۔ (مختلف مقامات کے لوگ کسی قرارداد کے بغیر جس طرح ایک ہی کام یعنی قتل و خون میں لگ گئے تھے اس سے) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح جھاڑو کی بہت سی سینکوں کو ایک ہی بندے باندھا جاتا ہے۔ اسی طرح گنتی شمار سے باہر ان لڑنے والوں کی کمریں بھی "ایک ہی کمربند" سے بندھی ہوئی ہیں۔

باغیوں کی مذمت

بے شک ہندوستان کو آرام و آسائش سے اس حد تک خالی کرنے کے لیے کہ اگر ان چیزوں کو ڈھونڈھا جائے تو ایک گھاس کے تنکے کے برابر بھی نشان نہ ملے۔ ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہو گئے۔ بہت سی فوجیں افسروں کے بغیر لڑائی کے

لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ توپیں، گولہ بارود، چھرے، غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا۔ لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انھیں سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

دل لوہے یا پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے۔ کیسے نہ بھر آئے۔ آنکھیں رخنۂ دیوار نہیں ہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیے۔ شہر حاکموں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا۔ جیسے باغ، باغبان سے خالی اور درختانِ بے ثمر سے پر ہو لٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد۔ گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لیے) "خوانِ مفت" کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گم نامی کے گوشے میں چھپے ہوئے تھے وہ گروہ در گروہ خنجر بکف اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسیوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ لٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محوِ خواب۔

شرفا کی تباہی

بڑے بڑے عالی خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے

لیے تیل نہیں۔ اندھیری رات میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے بجلی چمکنے کے منتظر رہتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہوا ہے اور پیمانہ کدھر ہے۔

(زمانے کی اس) بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رتبہ لوگ جو سارا دن مٹی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے۔ ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے۔ اور جن لوگوں کی محفل میں آتشِ گل سے چراغ روشن رہتے تھے اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔

کوتوال شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بزدل اور سیہ کار رہزنوں کے قبضے میں ہے۔ (زیور و آرائش سے معرّا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں ہلکا سا اندازِ ناز باقی رہا تھا۔ اس کو ان تو دولت گداز ادوں نے چھین لیا۔ کہ ان کی خود نمائی کے کام آئے۔ جو محبت کرنے والے پہلے نازنینانِ گل اندام کی ناز برداری کرتے تھے اب ان بدخصلتوں کے ناز اٹھانے پر مجبور ہیں۔ ان بے سروپا لوگوں کے دماغوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ اگر ان کی حرکات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکر کھاتے پھر رہے ہیں اور چھچھورے ہر وقت اس طرح ناز و خود نمائی میں محو رہتے ہیں گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے بہے چلے جا رہے ہیں۔ بڑے بڑے عالموں اور ناموروں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ

دولت تھی نہ عزت، وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں۔ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے۔ کمین آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں، جو صرف سکون و آسائش کے چند لمحوں اور انصاف کے خواہش مند ہیں۔ ؎

میرا درد بھرا حال تمہارے نزدیک ایک قصّہ ہے اور بس۔ لیکن اس کو
سُن کر ستاروں کی آنکھوں سے اشکِ خوں جاری ہو جائیں گے۔

ڈاک کا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ جس کے سبب سے بہت سے کام رک گئے۔ ہرکاروں نے آنا جانا بند کر دیا۔ ڈاک میں پیام بجنسہٖ پہنچانے کی گنجائش نہیں ہوتی، ہاں خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے۔ مگر اس محکمے کی ایک اور شاخ (ٹیلی گراف) ہے کہ نہ مضراب کی جنبش، بلکہ جنبش کی مضراب ہے، جو اس سے پیدا ہوتی ہے ہزاروں پیام (خبریں) اندر سے باہر نکلتے ہیں۔

غدر کی مذمت

(جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں۔ انصاف کو نظر انداز نہ کریں اور بتائیں کہ اس سارے انتظام کا درہم برہم ہو جانا، خدا کی بخشش

ہوئی دولت کا لٹ جانا، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا اور دوستوں کے حالات معلوم نہ ہونا۔ کیا یہ ساری باتیں اس لائق نہیں کہ ان کا ماتم کیا جائے اور آنسو بہائے جائیں۔ بڑے بڑے بہادروں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ اپنے سائے سے ڈریں، سپاہی، بادشاہ اور درویش ہر ایک پر حکومت کرنے لگیں کیا یہ صورتِ حال لائق افسوس نہیں ؟ ان روح فرسا مصائب پر آنکھیں آنسو نہیں بہائیں گی ؟ اور کیا اس نوحہ گری پر لعن طعن کرنا، اس ماتم سرائی پر طنز کرنا، اور اس گریہ وزاری پر ہنسنا جائز ہے؟ اور کیا ان پُرآلام حالات سے اظہارِ بیزاری کو ضعفِ ایمان اور نادرستیِ مذہب سمجھا جائے گا ؟ ؎

میں شعر و سخن کے جواہر سے کیا دل لگاؤں جب تک کہ آہِ گرم سے میرے دل پر ہزاروں آبلے پڑ گئے ہیں۔ میرا دل بجھ چکا ہے اور قویٰ اس حد تک جواب دے چکے ہیں کہ اب مجھ کو نہ سزا کا غم ہے نہ جزا کی خوشی۔

بادشاہ کی مجبوری

اس سرگزشت پر مصیبت کا مارا ہوا یہ اسیرِ قیدِ بستر (تنہائی) اس روداد غم کو پھر شروع کرتا ہے۔ جب پہلی بار وہ گمراہ جنگ جو آئے۔ تو جو خزانہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے خزانے میں جمع کر دیا اور اپنے سر شاہی آستانے پر جھکا دیے۔ جلد ہی زمانے نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ ہر طرف سے فوجیں،

ہونا شروع ہوگئیں اور اس سرزمین (دہلی) کی طرف روانہ ہوگئیں۔ بادشاہ جب فوج کا انتظام نہ کر سکا۔ فوج نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بادشاہ مجبور ہو کر رہ گیا۔ ؎

فوج نے بادشاہ کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ جیسے چاند کو گہن لگ جائے۔
ماہِ نو گہن میں نہیں آتا۔ گہن تو چودھویں رات کے چاند کو لگتا ہے۔
بادشاہ اس چاند کی طرح تھا جس کو گہن لگ گیا ہو۔ وہ ماہِ کامل
نہیں تھا۔

قیدیوں کی رہائی

میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ بات بیان کرنے کے لائق تھی کہ یہ شہرت طلب جنگ جُو جس مقام سے چلے وہاں کے قیدخانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پرانے پرانے قیدی جنھوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی۔ شاہی دربار میں آئے سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبیداری چاہی۔ آقاؤں سے بھاگے غیر وفادار غلاموں نے آستانِ شاہی کو بوسہ دیا اور کسی سرسبز علاقے کی حکومت کے طلبگار ہوئے۔ کوئی بھی نہیں کہتا ہے اور میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہر خواہش مند کو حاضر ہونے کی اجازت اور ہر پناہ مانگنے والے کو پناہ کیوں

دے دی جاتی ہے ؟ بس یہ زمانے کی بوالعجبی ہے۔

تعداد فوج

اب دہلی کے اندر اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے۔ صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ صرف شہر کے جانبِ مغرب ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ پہاڑی شہر سے کچھ دور نہیں ہے (انگریزوں نے) نہایت ہنر مندی سے اس جگہ پر مورچہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنا لیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اژدہا صفت، رعد خروش توپیں لگا دی ہیں اور استقلال کی مدد سے اس عالم پریشانی میں اطمینان (کی دولت) حاصل کر لی ہے۔

انگریزوں کی مورچہ بندی

شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا۔ اس میں سے چند توپیں شہر کی فصیل پر جما دی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سرداروں کا حریف فرض کر لیا ہے۔ توپوں اور بندوقوں کے دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اولے برس

رہے ہیں۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے جیسے اوپر سے پتھر برس رہے ہوں۔ مئی جون کی گرمیاں ہیں۔ دھوپ کی تیزی روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ آفتاب برج ثور و جوزا میں بے طرح آتش افروزی میں مشغول ہے۔ معلوم ہوتا ہے خود بھی اسی آگ میں جھلسا جارہا ہے۔ جو لوگ سرد ہوادار مکانوں میں آرام و آسائش کے ساتھ رہتے تھے دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں اور راتیں انھیں جلتے ہوئے پتھروں پر پیچ و تاب کے عالم میں بسر کرتے ہیں۔ اسفندیار اس میدانِ جنگ میں ہوتا تو روئیں تنی کے باوصف اس کی ہمّت و جوانمردی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سن لیتا تو جی چھوڑ دیتا (شہر کی فوج کے) مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آجاتے ہیں۔

بیرونِ شہر کی داستانِ شب و روز تو یہ تھی۔ اندرونِ شہر (کیا ہو رہا تھا اس سلسلے میں) ایک دن کا قصّہ سننے کے لائق ہے ؎

میرے ساز کے تاروں میں وہ نغمے پنہاں ہیں جن سے چنگاریاں
برستی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ مغنی ان کی زد میں نہ آجائے۔ میری زبان
پر وہ داستان ہے جس سے میرے دل پر خنجر چلنے لگتے ہیں۔

ایک شخص جس کے دماغ میں فرماں روائی و تکبّر کے خیالات بھرے

ہوئے تھے۔ درپردہ اپنے آقا اور مربیّ کا دشمن بن گیا۔ اس خیال سے کہ "اگر یہ واقف کار اور راز داں زندہ رہے گا تو میں نے جو خزانہ (ناجائز طریقوں سے) جمع کیا ہے اس کا راز کھل جائے گا۔" ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا تھا اور یہ بات مشہور کرکے کہ "حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے خیر خواہ اور طرفدار ہیں۔ فوج کے افسروں کو ان کی طرف سے بھڑکاتا رہتا تھا۔

حکیم احسن اللہ خاں

ایک دن کچھ لوگ (حکیم احسن اللہ خاں کو) قتل کرنے کے لیے ان کے محل پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند آشفتہ سر قلعے میں گئے۔ اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انتہائے محبت و بندہ پروری سے (حکیم صاحب کو بچانے کے لیے) اپنے آپ کو ان پر گرادیا۔ اس طرح حکیم صاحب بچے۔ جان تو بچ گئی لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہوگیا۔ (حکیم صاحب کا گھر (جو خوبصورتی و آرائش میں) نگارخانہ چیں کی طرح تھا لوٹ لیا گیا۔ ایوان کی چھت کو آگ لگادی گئی۔ چھت کے شہ تیر اور منقش تختے جل کر راکھ ہوگئے۔ دیواریں سیاہ پڑگئیں۔ گویا وہ محل

اس غم میں سیاہ پوش ہو گیا تھا۔ ؎

آسمان کی مہربانی سے دھوکا نہ کھانا۔ یہ بے وفا جس شخص کو آغوش محبت میں جگہ دیتا ہے اس کو کشمکش و عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

بُرے سے بُرا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آسکتا۔ بہ شرطیکہ وہ ولد الحیض نہ ہو۔ یہ خبیث نمک حرام جس کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں۔ بے حیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہو گیا ہے۔ اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کولھے مٹکاتا ہوا انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے۔ میں نے اس کا نام اس لیے نہیں لکھا کہ وہ ایک گدازادۂ گم نام ہے۔ میں اس پر لعنت بھیج کر جو داستان کہہ رہا تھا اس کو پھر شروع کرتا ہوں۔

تفضّل حسین خاں

فوجیں ہر طرف سے آ آ کر جمع ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا۔ اس وجہ سے دور دور کے سردارانِ فوج اُٹھ کھڑے ہوئے تھے — فرخ آباد کے نامور (سردار) تفضل حسین خاں نے جن کو کبھی بادشاہ سے علاقۂ نیاز مندی نہیں تھا۔ دور ہی سے آستانِ شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیاز مند قدیم لکھا۔

خان بہادر خاں

خان بہادر خاں نے جو گمراہ شہرت طلب تھا اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا۔ ایک سو ایک اشرفیاں نذرانہ سازوسامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہ شاہی میں بھیجا۔

نواب یوسف علی خاں

چشم بد دور خورشید نشان نواب یوسف حسین خاں بہادر فرمانروا رامپور نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتہ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں بھی کسی طریقے سے اس کو نہیں توڑا جا سکتا۔ مجبوراً صرف زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

واقعاتِ لکھنؤ

لکھنؤ میں جب فوج نے (انگریزوں سے) رشتہ تعلق توڑ لیا (اپنے) انگریز (دشمن کی) اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے۔ لیکن (فوج کے) چند سرداروں نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر

بیلی گارد میں قیام کیا جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادری کے ساتھ دروازے بند کر لیے۔

شرف الدولہ نے جو بڑے واقف کار، اور معاملات کو سمجھنے والے تھے اور جو نوابانِ اودھ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر سرفراز تھے۔ اس کم تعداد لیکن باشان و شوکت گروہ (انگریز) کو نظر انداز کر کے واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تختِ حکومت پر بٹھا دیا اور اس کو شہنشاہ ہندوستان کا وزیر اور اپنے آپ کو پیش کار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اس نامور شخص (شرف الدولہ) نے گویا ہما کو گرفتار دام کر لیا تھا۔ جب یہ سارا کام مکمل کر لیا ایک منتخب شخص کو مناسب پیش کش کے ساتھ (دہلی) روانہ کر دیا۔ قاصد آیا۔ دو روز آرام کی پھر بارگاہِ شاہی میں حاضر ہوا۔ دو صبا رفتار گھوڑے، دو کوہ صفت ہاتھی، ایک سو اکیس اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ برنگ کے نایاب موتیوں سے مزین تھی، پیش کی اور ایک جوڑ بازوبند جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے بیگم کی خدمت میں محل میں بھیجا۔

یہ ساری شان و شوکت روشنیِ چراغ کی طرح (جلد ختم ہونے والی) تھی گویا زمانے کی نظر بد اسی رونق کی منتظر تھی۔ حکومتِ اودھ کی اس پیش کش کے بعد آئینہ و سکندر اور جام و جمشید کی ساری داستان ختم ہو گئی (باغی) فوج کے شور و غل سے نصیب کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ پھر مند گئیں۔ نہیں نہیں

شہنشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ دنیا والوں کی نگاہوں سے پنہاں ہوگیا ؎

جب قسمت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے تو تاج کی بھی کوئی قیمت
نہیں رہتی تم نہیں دیکھتے کہ تغیر کے خوف سے سورج آسمان پر کیسا
کانپتا رہتا ہے۔

۱۴ر ستمبر

جس دن وہ سبز قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی اس کے کل کو پیر کے دن قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے (انگریزوں) نے شان وشکوہ کے ساتھ کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کے فوج کو بھاگتے ہی بنی ؎

مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اُٹھ گیا تھا تو ستمبر میں ظلم وستم
کا دور ختم ہوگیا اور انصاف کا زمانہ واپس آگیا۔ چار مہینے چار دن کے بعد
سورج آب وتاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دہلی دیوانوں سے خالی ہوگئی۔
عقل مند (انگریزوں) نے بہادری کے ساتھ اس پر قبضہ کرلیا۔

اگرچہ ۱۱ر مئی سے ۱۴ر ستمبر تک ۴ مہینے ۴ دن کا وقفہ ہے لیکن اس بنا پر کہ پیر کے دن شہر (انگریزوں) کے ہاتھ سے نکلا تھا اور پیر ہی کے دن

قبضے میں آیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں آجانا یہ دونوں کام ایک ہی دن میں ہوئے۔ مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحبِ عزّت افراد عزّت و آبرو کی دولت کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔

شہر میں بد باطن (باغیوں) کی جو فوج تھی۔ اس میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ اور کچھ لوگوں نے غرور میں آکر لڑنے کی تیاری کی خبیث اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاتحین سے اُلجھ پڑا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں تو دشمنوں کو قتل کر رہے تھے۔ لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزّت و آبرو کو برباد کر رہے تھے۔

دو تین دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔ مجھ مردہ دل کا غم کدہ (مکان) وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

انگریزوں کی فتح اور مظالم

میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروساماں لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔

اس غصّے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے مُنہ فق ہو گئے۔ بے شمار مرد عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحبِ حیثیت بھی۔ ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے ان میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں آجائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔

میرے دل پر نہ خوف و دہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں گناہ گار تو ہوں نہیں کہ سزا پاؤں! انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور شہر کی آب و ہوا ناساز گار نہیں ہے مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بدخیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور ادھر ادھر بھاگتا پھروں۔

(اب) مکان کے ایک گوشے میں بے سروسامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا

ہوں (اس تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں ؎

میں بالکل مفلس اور بے سروسامان ہوں۔ خداوندا! کب تک یہ سوچ
سوچ کر خوش ہوتا رہوں گا کہ یہ جواہر (کلام) میری ہی کان کے ہیں۔

ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا۔ ازل میں قسمتیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہر ایک کو نوشتہ قسمت کے مطابق سروساماں عطا کیا گیا ہے۔ مصیبتیں اور راحتیں اسی حکم ازل کا نتیجہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بے دلی و بے جگری کو چھوڑ کر جس طرح بچے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ہر لمحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت فزا نیرنگیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھتا رہوں۔

۱۸ ستمبر

جمعہ کے دن محرم کی ۲۶ تھی اور ستمبر کی ۱۸۔ دن چڑھے دنیا کو خوشی بخشنے والا آفتاب عالم تاب برج سنبلہ کے ایک درجے میں پہنچ کر کسوف میں آگیا اور اہل عالم کی چشم جہاں بیں پر تاریکی نے ظلم ڈھایا۔ گمراہ باغی اندرون و بیرونِ شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس گلی تک آگئی۔ خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

کوچے کی دربندی

اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف ہے ہے (گلی اندر سے بند ہے) گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے (اس گلی کے) زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں (اس طرح کہ) عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے سروں پر سامان کی گٹھریاں تھیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پتھر چن دیے۔ گلی سربستہ تو تھی ہی دربستہ بھی ہو گئی۔ (ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہو گیا)

میری روح جسم سے زیادہ خستہ و درماندہ ہو تو تعجب کی بات نہیں۔
کیونکہ میرا دل قید خانے کے گوشے سے بھی زیادہ تنگ ہے۔

مہاراجہ پٹیالہ کی مدد

(اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ فلک مرتبہ مریخ حشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرماں روائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریز) فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے۔ راجہ کے چند ملازمین خاص، جو ان کی سرکار میں اونچے

عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور اور قابلِ عزّت لوگوں میں سے ہیں (میری مراد ہے) حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں، حکیم غلام اللہ خاں (سے) جو حکیم شریف خاں جنّت مکان کی اولاد میں ہیں۔ اس کوچے میں رہتے ہیں۔ دور تک ان کی دورویہ عمارتیں چلی گئی ہیں۔ میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحب جاہ ثروت کا پڑوسی ہوں۔ ان تین حضرات میں سے اول الذکر (حکیم محمود خاں) متعلقین اور اہلِ خانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باعزّت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں حضرات پٹیالہ میں راجہ کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ رہتے ہیں۔

چوں کہ دہلی کی فتح متوقع تھی۔ راجہ نے از راہِ بندہ پروری طاقتور اور جنگ جو (انگریزوں) سے طے کر لیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہوگا اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرر کر دیے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی جن کو گورا کہتے ہیں گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

اثنائے کلام میں کبھی کبھی (مجبوراً) چند دوسری باتوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ ان ضمنی باتوں کے بعد (میں) پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔ سارے شہر میں ۱۵ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکان دار اور خریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم فروش ہے کہ گیہوں خریدیں۔ نہ دھوبی ہے کہ کپڑے دھلنے کو دیں۔ حجام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے

بال تراشے اور مہتر کو کہاں سے ڈھونڈھ کر لائیں کہ صفائی کرے۔ بہرحال جیساکہ میں نے بیان کیا ہے ان پانچ دنوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے۔ کبھی کبھی آٹا بھی مل جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ صورتِ حال بالکل ختم ہوگئی (گلی کا) دروازہ پتھروں سے بند کر لیا گیا اور دلوں کے آئینے پر غم والم کا غبار چھا گیا ۔ ؎

کوششوں کے سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب مصیبتیں خون
کو آگ کی طرح جلا رہی ہیں۔

پانی اور غلّے کا قحط

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ پانی اگرچہ بیحد احتیاط سے پیا گیا لیکن آخر کار کوزے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ عورتوں مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی صبر کے ساتھ دن گزارنے اور (اپنے آپ کو) سامانِ خورد و نوش حاصل کرنے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا۔ دو شبانہ روز سب بھوکے پیاسے رہے۔ ؎

افسوس! یہ گریہ وزاری اور ذلّت و محتاجی! اور صد حیف یہ بے چارگی
و پریشاں حالی اور بے سروسامانی!!

تیسرے دن جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے مہاراجہ (پٹیالہ) کی فوج کے سپاہی آگئے اور پہرہ دینے لگے۔ گلی کے رہنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے خوف سے نجات پائی۔ "ہرچہ بادا باد" کہتے ہوئے پہرہ داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی۔ یہ پہرہ ازراہ دوستی تھا نہ کہ ازراہِ دشمنی. اس لیے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جا سکتے ہیں۔ چوک کے آگے قتل و خون کا بازار گرم ہے اور راستہ پُر خطر ہے۔

مجبور و پریشاں حال لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ بھشتی یا مشک کا ملنا ناممکن تھا۔ اس لیے ہر گھر سے ایک مرد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دور تھا اور (اتنی) دور جا نہیں سکتے تھے۔ مجبوراً نیم شور پانی مٹکوں اور گھڑوں میں بھر لائے۔ اس طرح اس نمکین پانی سے وہ آگ بجھی جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔

باہر جانے والے اور پانی لانے والے لوگ کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے۔ سپاہیوں نے کچھ مکانوں کے دروازے توڑ ڈالے (ان گھروں میں) نہ تو بورے میں آٹا ملا، نہ برتن میں روغن۔ میں نے کہا اچھا بندہ وہ ہے۔ جو برتن، تھیلے، آٹے اور تیل کا ذکر نہ کرے۔ ہماری روزی تو ایسے روزی رساں کے ذمہ ہے۔ جو ہم کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ خدا کی بخشش کا شکر نہ ادا کرنا شیطنت ہے۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ کوئی بات سننے کو ملے۔ نہ خود باہر جا (سکتے) ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھیں۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور۔ اس کش مکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔

ایک دن اچانک بادل آگیا۔ پانی برسا۔ ہم نے (صحن میں) ایک چادر باندھ لی اور ایک مٹکا اس کے نیچے رکھ دیا۔ اور (اس طرح) پانی حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بادل دریا سے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے۔ (لیکن) اس بار یہ ہماصفت بادل پانی چشمۂ حیواں سے لایا۔ گویا سکندر نے جو چیز اپنی بادشاہت کے دور میں ڈھونڈھی تھی۔ مجھ پریشاں حال نے وہ دولت (آبِ حیات) (اس) تباہی و بربادی کے عالم میں پالی ہے

اے غالب دوست کی طرف سے کبھی کوتاہی نہیں ہوئی۔ (البتہ) وہ اس طرح کام بناتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پاتے ہیں۔

سوانح غالب

اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی زندگی اور اشغال کے متعلق بھی لکھوں۔ اس طرح کہ یہ سرگزشت سلسلۂ کلام سے غیر متعلق نہ ہونے پائے۔

میں نئے داغوں سے زخم ہائے جگر پر مرہم رکھ رہا ہوں۔ اور میں نشتر کی مدد سے دل سے پیکاں نکال رہا ہوں۔

اس سال میری زندگی کا باسٹھواں سال شروع ہوا (اتنی مدت سے) میں اس دنیا کی خاک چھان رہا ہوں اور پچاس برس سے شعروشاعری میں مصروف جگر گدازی ہوں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خاں بہادر کا انتقال ہوگیا۔ خدا ان کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے۔ میرے چچا نصراللہ بیگ خاں بہادر نے مجھ کو اپنا بیٹا بنالیا اور لاڈ پیار سے پرورش کی۔ جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو میرے چچا جو میرے سرپرست بھی تھے۔ موت کی گہری نیند سوگئے (گویا) میری قسمت سوگئی۔

(میرے یہ) لائق تعریف و صاحب جاہ وحشمت (بزرگ) چارسو سوارو ں کے سردار اور جنرل لارڈ لیک بہادر کے وفادار متعلقین میں سے تھے۔ اس فاتح اور سخی سردار کی مہربانی سے وہ آگرہ کے قریب دو پرگنوں کے حاکم اور مالک تھے۔ ان کے انتقال کے بعد (وہ) دونوں پرگنے انگریزی حکومت نے واپس لے لیے۔ اس جاگیر کے بجائے میرا اور میرے حقیقی بھائی کا کچھ وظیفہ مقرر کردیا گیا جو میری آرام و آسایش کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں اپریل تک کا وظیفہ کلکٹری دہلی کے خزانے سے

میں نے حاصل کیا۔ مئی سے اِس خزانے کا دروازہ ہی بند ہو گیا (اب) میں بدنصیبی سے دوچار ہوں۔ اور دل طرح طرح کے خیالاتِ پریشاں کا مسکن ہے۔

اس سے پہلے صرف بیوی تھی۔ نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی۔ تقریباً پانچ سال ہوئے کہ میں نے اپنی بیوی (جو میری تباہی کی ذمہ دار ہے) کے خاندان کے دو بے ماں باپ کے بچّوں کو لے کر پال لیا ہے۔ ان شیریں زباں بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس عالمِ بے چارگی میں (دونوں بچے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن و گریباں کے پھول ہیں۔

مرزا یوسف

بھائی جو دو سال مجھ سے چھوٹا ہے۔ تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہو گیا تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو ستاتا ہے نہ شور و غوغا کرتا ہے۔ اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچّوں اور کنیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ گھر کے فاترالعقل مالک اور سارے سامان کو ایک بڈھے دربان اور ایک بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اگر میں جادو جانتا ہوتا تب بھی (ان حالات میں) کسی کو بھیج کر ان

تینوں آدمیوں کو نہ بلوا سکتا تھا نہ سامان منگوا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا غم ہے اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے۔

وہ دو نوں ناز پروردہ بچے پھل، دودھ، مٹھائی مانگتے ہیں۔ لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس! افسوس! اس ایک بات کو کیا کہوں۔ جب تک زندہ ہوں روٹی اور پانی کی فکر رہے گی اور مرنے کے بعد کفن دفن کی۔ میں دن رات اس فکر میں رہتا ہوں کہ بھائی نے دن میں کیا کھایا (ہوگا) اور رات میں کیسے سویا (ہوگا) اور (حالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ (بھائی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اٹھاتے اٹھاتے) مرگیا۔ ؎

میرے ہونٹوں پر صرف آہ و فغاں نہیں ہے۔ خدا کی قسم (اس غم سے) میں جاں بہ لب ہوں۔

جو حالات میں نے بیان کیے یہ دل دکھانے والے ہیں لیکن جو کچھ میں کہہ نہیں سکا ہوں وہ روح فرسا ہے جو لوگ حالات سے واقف ہیں میں ان سے توقع کرتا ہوں کہ وہ میری پُر درد داستان کو غور سے سنیں گے اور سُن کر انصاف کریں گے۔

قصیدہ مدح ملکہ وکٹوریہ

میں اس بڑھاپے میں چراغ صبح اور آفتاب لب بام کی مانند ہوں۔

میرا مطلب چراغ کی روشنی اور سورج کی نور افشانی سے نہیں ہے بلکہ جس طرح صبح کے وقت چراغ کا روغن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہلکی ہو جاتی ہے اور دن ڈھلے سورج کی چمک دمک ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ وہی میرا حال ہے۔ دو سال ہوئے کہ میں نے ملکۂ انصاف پسند، فلک رفعت، ستارہ حشم ملکۂ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور ڈاک سے، جو دہلی سے براہِ راست بمبئی اور وہاں سے لندن جاتی ہے۔ آقائے ہنر پرور و حاکم نام ور لارڈ الن برا بہادر کے حضور میں بھیجا۔ جو گورنری کے زمانے میں ازراہِ کرم میرے مربی تھے۔ ؎

راہ سخن کشودم اگر خود نہ شد کہ بخت

راہم بہ بزمِ بانوے گیتی ستاں دہد

یہ شعر اسی قصیدے کا ہے۔ وہ قصیدہ اسی ردیف قافیے میں ہے۔ کسے خیال تھا کہ ایسا مشکل کام اس آسانی سے بن جائے گا۔ تین مہینے کے بعد اچانک ایک مبارک قدم قاصد اس سروِ بوستانِ سروری (لارڈ الن برا) کا نوازش نامہ لایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ نہایت محبت کے ساتھ لکھا تھا کہ قصیدہ ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم نے اس کو ملکۂ معظمہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے متعلقین بارگاہِ شاہی کے سپرد کر دیا۔ اس پُر مسرت پیغام اور مبارک جواب کو تیس دن نہیں گزرے تھے کہ سردار مہربان مسٹر رزنگٹن

بہادر کا گرامی نامہ ڈاک سے آیا۔ لکھا تھا کہ جو قصیدہ لارڈ ڈالہن براہ بہادر کے واسطے سے ہمارے پاس پہنچا تھا۔ اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ سائل ضابطے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی گزارشات فرماں روائے ہندوستان کے وسیلے سے ہماری بارگاہ میں پیش کرے۔

غالب کے تین مطالبات

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک معروضہ شہنشاہ انگلینڈ کے نام (لکھ کر) سکندر جاہ، فریدوں حشم لارڈ کیننگ نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں بھیجا۔ اس گزارش نامے میں التماس و آرزو کو اس طرح پیش کیا گیا کہ روم ایران اور دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے شاعروں اور مداحوں کو طرح طرح سے نوازا ہے۔ موتیوں سے منہ بھر دینا، سونے میں تلوانا، گاؤں عطا کرنا، اور انعام دینا، غرض مختلف انداز رہے ہیں۔ اس مداح کی یہ خواہش ہے کہ ملکۂ معظمہ اپنی زبانِ (مبارک) سے مہر خواں (خطاب) ارشاد فرمائیں۔ اپنے حکم سے سراپا (خلعت) بخشیں اور اپنے خوان سے چند نان ریزہ (روٹی کے ٹکڑے) عنایت فرمائیں۔ مہر خواں اور سراپا کا ترجمہ عربی میں خطاب اور خلعت ہو سکتا ہے اور نان ریزہ کو انگریزی میں پنشن کہہ سکتے ہیں۔

حاکمِ بلند مرتبہ نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب میں میرے دلِ غم زدہ

کو بشارت مداوائے شاد فرمایا (موصوف) نے لکھا کہ (وہ) ستائش نامہ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ اس خبرِ مسرت اثر سے میں ایسا مسرور ہوا کہ جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔

مایوس کن جواب

چار ماہ کے بعد میرے خط کے جواب میں فرخ شمائل، عالی نسب مسٹر رسل کلرک بہادر کے خامۂ مشک بار کا لکھا ہوا مودت نامہ (موصول ہوا) اس (جواب نے) امیدواری اور آرزومندی کی مدت کو اور بڑھا دیا۔

میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا، اور ناخدا ترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اُجڑ جاتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا جس سے مرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔

اب وہ مبارک خطوط، جو میری پرجوش آرزوؤں کی فہرست ہیں اور میرے ہوش و خرد کے بازو کا تعویذ میرے پاس ہیں اور جگر کے چند ٹکڑے جو جوشِ گریہ میں آنکھوں سے ٹپکے ہیں۔ جگر خراشی و خوں فشانی کے نشان کے طور پر میرے دامن میں ہیں۔ ؎

میں تیر یا تلوار کا زخمی نہیں ہوں۔ نہ پلنگ و شیر نے مجھے مجروح کیا

ہے۔ میں (شدتِ غم میں) اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں اور زبان کو خون آلود کر لیتا ہوں۔ خونِ (جگر) کھاتا ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں۔

مرزا یوسف کے گھر کی تاراجی

ستمبر کی اکتیسویں[۳۱] تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے سترھویں دن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے بھائی کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ گلی اور گھر میں لوٹ مار کی۔ دیوانے مرزا یوسف خاں اور دونوں بڑھیا بڈھوں کو زندہ چھوڑ دیا۔ اس بھاگڑ میں دو ہندو کہیں سے آ کر (گھر) میں پناہ گزیں ہو گئے۔ بوڑھے دربان اور بڑھیا کنیز (ماما) دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے۔ اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔ اگر کوئی (سپاہی) رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے۔ تو یہ ذاتی رحم دلی اور سنگدلی کا نتیجہ ہے۔

انگریز سپاہیوں کی معقولیت اور امن پسندی کا اعتراف

میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہار اطاعت کرے اس کو قتل نہ کیا جائے۔ مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے، مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انھوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی۔ اسی وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں، قتل نہیں کرتے، بہت کم ایسا ہوا ہے۔ اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا۔ پھر سامان لوٹ لیا (البتہ) بوڑھوں، عورتوں، اور بچّوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر تو خامہ رُک گیا۔ اب میں ایک پُرزور آواز بلند کروں کہ سمندِ قلم قدم آگے بڑھائے۔ اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو برا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمّت اور انصاف کی تعریف میں تمھاری زبان اور تمھارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد، اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ بے چاری عورتوں، اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچّوں کو قتل کیا (حالاں کہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں

کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا۔ چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع اس کا تھا کہ (شہر پر) قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے۔ (لیکن انھوں نے) ضبط کیا۔ (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔ یہ جو گھر بار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔ جن لوگوں کو باز پرس کے لیے بلایا گیا ہے ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔ کچھ لوگ بہ دستور امید و بیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں۔ جو لوگ (شہر سے نکل کر) ویرانوں اور گوشوں میں مقیم ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کوئی حکم (صادر) نہیں ہوا جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں۔ یا جو شہر کے اندر مبتلائے پریشانی ہیں ان کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش (شہر کے) اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہوتے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے پریشان ہے۔ شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال۔ سب کے دل درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتلِ عام

کے خوف سے ہراساں ہیں۔

کرنل براؤن کے سامنے پیشی

۵ر اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفریں دن (تھا) دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے۔ جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے (وہاں سے) ایک چھت پر (اور چھت سے) کود کر گلی میں آگئے۔ راجہ نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا۔ (نہیں روک سکے) دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں (گھس) آئے۔ (ان گوروں نے) بھل منسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند، دانشور کرنل براؤن کے پاس لے گئے۔ جو چوک سے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے۔ (کرنل براؤن نے) مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا، خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس خوش اخلاق (کرنل براؤن) کی تعریف کی اور چلا آیا۔

۷؍اکتوبر

۷؍اکتوبر کو شام کے وقت ۲۱ توپوں کی آواز نے (قوت) سامعہ کو نوازا۔ اور آگہی کو غرق حیرت کر دیا (میں سوچنے لگا کہ) لفٹننٹ گورنر بہادر کے آنے پر سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور نواب گورنر جنرل بہادر کے آنے پر انیس توپوں کی۔ اکیس توپوں کی ہوش افزا سلامی کی کیا وجہ ہے۔ دوسرے دن بھی نہ اس ناواقفیت میں کوئی کمی ہوئی نہ معلومات میں کچھ اضافہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے پست و بلند کو ہموار کرنے والے (انگریزوں) کو کسی دوسری جگہ باغیوں پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اور ان کے دل، خدا کرے خون ہو جائیں۔ اور ان کے ہاتھ کہ خدا کرے بے کار ہو جائیں، اسی کام (لڑائی) کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

میواتیوں کی شورش

ادھر سوہنہ اور نوح کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلا رکھی ہے جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ تلارام نامی

ایک شورش پسند کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی رہنمائی سے میواتیوں سے مل گیا۔ یہ گروہ میدانوں اور پہاڑوں میں (انگریز) حاکموں سے برسرِ جنگ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آندھیوں اور بھڑکتی آگ کے ہنگامے بپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں، جن کا آغاز یاد نہیں ہے اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے، رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہو تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روزِ سیاہ (بدنصیبی) کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے (کہتا ہوں) کہ روزِ سیاہ (بدنصیبی) تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔

خانہ نشینی

جس دن گورے مجھ کو پکڑ لے گئے تھے اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا، یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے۔ گویا گنجہ کے دانشور (نظامی گنجوی) نے میری ہی زبان سے کہا ہے۔ ؎

میں نہیں جانتا ہوں دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا اچھائی ہو رہی ہے کیا برائی۔

ان لاعلاج غموں، اور مرہم بیزار زخموں (کے ہوتے ہوئے تو) مجھ کو یہ سوچنا چاہیے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو باز پرس کے لیے اٹھایا گیا اور جزائے اعمالِ بد کے نتیجے میں دوزخ کے کنویں میں لٹکا دیا گیا ہے۔ مجبوراً اس قید میں بے چارگی و پریشانی کے ساتھ ہمیشہ رہنا پڑے گا۔ ؎

مجھ پہ جو کچھ آج گزر رہی ہے اگر کل بھی یہی گزری (تو) آہ (کیا ہوگا)۔

کیفیت روزنامچہ نگاری

اس کتاب میں شروع سے آخر تک یا ان حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزر رہے ہیں یا ان واقعات (کا ذکر) ہوگا جو سننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنی ہوں گی یا کچھ کم کر کے لکھی ہوں گی۔ میں دار و گیرِ خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔ آنکھیں بے کار ہیں، دل قید (غم) میں ہے اور لب ساکت ہیں۔ لوگوں کی زبانوں سے میرے کانوں کو معلومات کی بھیک ملتی ہے۔ کیسی بری ہے یہ گدائی! اور وہ بھی اس بے سروپائی کے ساتھ۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا (حالاں کہ ان واقعات کو) فتح شہر کی داستان کے دیباچے

کے طور پر (آغاز ہی میں) لکھنا چاہیے تھا۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ ہیں اور ابھی بغیر سُنی ہوئی باتیں بہت ہیں۔ یقیناً جب میں اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں اِدھر اُدھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی باتیں لکھوں گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعات) داستان کی تقدیم و تاخیر پر از روئے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔

۱۹ ر اکتوبر

۱۹ ر اکتوبر کو پیر کے دن نے 'جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے' آتش فشاں اژدھے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کمبخت دربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتارِ راہِ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی، رومال، غسال، گورکن، اینٹ چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت کو) کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں۔ بازار میں اچھا بُرا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی

شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مُردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں (لیکن) مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں۔ چہ جائے کہ میّت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

مرزا یوسف کے کفن دفن کا انتظام

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میّت کو غسل دیا۔ دو تین چادریں یہاں سے (گھر) لے گئے تھے۔ ان میں لپیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی زمین کھودی (قبر بنائی) میّت کو اس گڑھے میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔ ؎

افسوس کہ ساٹھ سال کی عمر میں (وہ) تیس سال شاد رہا اور تیس سال ناشاد قبر میں اس کو بالش خشت بھی نہ ملا خاک کے علاوہ اور کچھ اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اے خدا اس مرنے والے پر رحم کر کہ اس نے زندگی میں آرام (کی صورت) نہیں دیکھی۔ اس کی دلجوئی کے لیے کسی فرشتے کو بھیج اور اس کی روح کو بہشت میں داخل کر۔

یہ نیک سرشت لیکن بد قسمت شخص جس نے زندگی کے ساٹھ سال

خوش و ناخوش گزارے۔ تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوشی (دیوانگی) کے عالم میں۔ زمانۂ ہوش مندی میں غصّہ ضبط کرنا، اور عالمِ دیوانگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا، ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ کی شب میں مرگیا ہے۔ ؎

ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب مرزا یوسف کی تاریخ (وفات)

پوچھی۔ جس نے اس دنیا میں اپنے سے بیگانہ ہو کر زندگی گزاری۔ میں

نے ایک آہ کھینچی اور کہا "دریغ دیوانہ"۔

تاریخ وفات مرزا یوسف

واضح ہو کہ "دریغ دیوانہ" سے ۱۲۹۰ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے آہ کے ۱۶ عدد نکال دیے جائیں تو ۱۲۷۴ رہتے ہیں جو مطلوب ہیں۔ ؎

اس خدا کے نام کہ جس کے حضور میں معذرت کرنا ہی مناسب ہے

تم جہاں سر جھکاؤ گے۔ اسی کا آستانہ ہوگا۔

فرماں روائے لوہارو کی تباہی

جس ہفتے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا۔ اسی ہفتے نام دارانِ

دانش مند امین الدین احمد خاں بہادر اور محمد ضیاء الدین خاں بہادر نے حفظ وضع کی خاطر اور امید بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنہ لوہارو کا رخ کیا۔ جو ان کی آبائی جاگیر ہے۔ پہلے مہرولی گئے اور اس گورستانِ پُر انوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔ دو تین روز آرام کی۔ اس دوران لٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے۔ البتہ تینوں ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ ہمراہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال لے گئے تھے۔ تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے جیسے تین جلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت اٹھا کر (اس) بے سرو سامانی کے ساتھ جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

(دوجانہ کے) نام ور اور نیک کردار (فرماں روا) حسن علی خاں بہادر نے ازراہِ انسانیت و فیاضی (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر "میرا گھر بھی آپ ہی کا گھر ہے" ان سب کو دوجانہ لے گئے۔

قصہ مختصر سردار خوش خصال (حسن علی خاں) نے اپنے ہم سر (مہمانوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہِ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بلا لیا۔ (یہ لوگ

شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی۔ (صاحب کمشنر) نے کچھ دیر طعن وتشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سُنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعہ کے اندر ایوانِ خانسامانی کے پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

تسلسلِ کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان کو لوٹا گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے نذرِ غارت گری ہوئے۔ جو سامان یہ لوگ (مہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا۔ بس متعلقین زندہ دوجانہ پہنچے۔ اور جو سامان یہاں محلات میں تھا سب لُٹ گیا۔ بس اینٹیں پتھر باقی رہ گئے۔ نہ سیم وزر محفوظ رہا۔ نہ لباس وبستر کا ایک تار بچا۔ خدا (ان) بے گناہوں پر رحم کرے۔ اس آغازِ ناسازگار کا انجام بخیر ہو اور (ان) کو اس مصیبت کے بعد آرام نصیب ہو۔

حاکم جھجھر اور حاکم فرخ نگر کی گرفتاری

یقیناً اکتوبر کی ۷، ار تاریخ تھی اور سنیچر کا دن کہ یہ دونوں دانش منداں یگانہ شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے (پہلے) کہا ہے قلعہ میں قیام کیا۔ اس واقعہ کے دو تین دنوں کے بعد فوج کو حکم دیا گیا۔ فوج گئی اور جھجھر کے حاکم عبدالرحمان کو مجرموں کی طرح لائی۔ قلعہ کے اندر ایک ایوان کے گوشے

میں جس کو دیوانِ عام کہتے ہیں (ٹھہرنے کے لیے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کر لی۔

۳۱ اکتوبر کو جمعہ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خاں کو اسی طرح (گرفتار کر کے) لائے۔ جیسے عبدالرحمان خاں کو لائے تھے اور قلعہ دہلی میں ایک الگ جگہ ان کو ٹھہرایا گیا۔ فرخ نگر بھی تیز دست تباہ کاروں کا نشانہ بنا اور شہر والوں کا مال و اسباب لُٹ گیا۔

حاکم بہادر گڑھ اور حاکم بلّب گڑھ کی گرفتاری

۲ نومبر کو پیر کے دن دادری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خاں گرفتار ہو کر آگئے اور قلعہ میں جہاں ٹھہرایا گیا ٹھہرے۔ ۷ نومبر کو سنیچر کے دن راجہ ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آجانے سے قلعہ میں جو سردار مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دور مقیم تھے ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔ واضح ہو کہ دہلی کی اجنسی کے ماتحت جو جاگیریں ہیں۔ وہ شمار میں ہفتے کے دنوں سے کم یا زیادہ نہیں ہیں (دہلی کے ماتحت سات جاگیریں ہیں) جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، لوہارو، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی۔ ان میں سے پانچ جاگیروں کے حاکم جیسا کہ میں نے کہا قلعے میں موجود ہیں اور بقیہ دو جاگیردار پاٹودی اور دوجانہ بھی خوف کے تیر کا نشانہ ہیں۔

دیکھو! ان کی جہاں بیں آنکھیں دنیا میں کیا دیکھتی ہیں اور کیا انجام ہوتا ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اور ذوالفقار الدین حیدر خاں جن کا لقب حسین مرزا ہے۔ اس ہنگامے میں دوسرے باعزّت لوگوں کی طرح بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے۔ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیے۔ اور صحرانوردی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات، محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ (اتنے وسیع کہ اگر ان محلات وایوانات کی) زمین کی پیمائش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گاؤں کے برابر تو (رقبہ) ہو گا۔ اتنے بڑے محل اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں لوٹ مار (کرنے والوں کے ہاتھوں) صاف اور ویران ہو گئے۔

کچھ کم قیمت لیکن بھاری سامان جیسے ایوان کے پردے، شامیانے، سائبان، شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا۔ اچانک ایک رات (جس کی صبح کو راجہ ناہر سنگھ گرفتار ہوئے، اس سامان میں آگ لگ گئی۔ لپٹیں اُٹھنے لگیں، لکڑی، پتھر، دیواریں سب جل گئیں۔ یہ عمارت میرے مکان سے جانبِ مغرب اتنی قریب ہے کہ میں آدھی رات کو بھڑکتی ہوئی آگ کی روشنی چھت پر سے دیکھ رہا تھا اور دھوئیں کی گرمی میرے چہرے اور آنکھوں تک پہنچ رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت پچھیاؤ چل رہا تھا راکھ میرے اوپر آ رہی تھی۔ ہاں پڑوسی کے گھر سے (بلند ہونے والے)

ننھے سومنات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر پڑوسی کے گھر کی آگ راکھ کیوں نہ برسائے۔

شاہزادوں کی سرگزشت

راقم حالات کے قلم کی جنبش (اس واقعے کے اثر سے) جو نیم مردہ چیونٹی کی رفتار کے برابر ہے (سست ہے) (منجمد) کاغذ پر (اس حالت) کی کیا عکاسی کر سکتی ہے کہ نگاہیں اس کو دیکھ سکیں۔ شاہزادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض کو گولی ماردی گئی (اس طرح) موت کے اژدھے نے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا (اس طرح) رسنِ دار کی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی۔ چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض (عالم غربت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

جاگیرداروں کا قتل

جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علاحدہ علاحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح (ان لوگوں کو) ہلاک کیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہا یا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء

جنوری ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمان آزادی مل گیا۔ اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے۔ شہر کی طرف چل پڑے۔ خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب سے) سبزہ اس قدر اُگ آیا ہے کہ درو دیوار سبز ہیں۔ ہر لمحہ سبزۂ سرِ دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ (بدستور) خالی ہے۔

حکیم محمود خاں کے متعلقین کی گرفتاری

شاید بدخصلت مخبروں کے کہنے سے حاکمِ شہر کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ (ان) بے ہودہ گو ہنگامہ ساز (مخبروں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں (موجود) بھی ہوں اس خیال سے ۲ فروری کو منگل کے دن (حاکم شہر) کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساٹھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اگرچہ کئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا

لیکن باعزّت لوگوں کا بھی خیال رکھا۔

۵؍فروری

۵؍فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے بھتیجے عبدالحکیم خاں عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ ۱۲؍ فروری کو جمعہ کے دن چند دوسرے اشخاص اور ۱۳؍فروری کو سنیچر کے دن تین شخص اور واپس آگئے (لیکن) نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور ہنگامہ جو گلی میں برپا ہوا (اس کی وجہ سے) مجھ درویش غم زدہ کا دل بھی قابو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس دار و گیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ ابھی تک (یہ عالم ہے) کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سو پاتا ہوں۔

قصیدہ در مدح سر جان لارنس

فروری کے پُرشوکت مہینے میں کہ اس زمانے سے ماہ فروردیں تک (جو موسمِ بہار کا پہلا مہینہ ہے) جس میں آفتاب کی رونق و روشنی بڑھ جاتی ہے۔ سورج کو ابھی (برج حمل تک پہنچنے کے لیے) ایک

مہینے کا سفر طے کرنا ہے۔ حاکم مہرباں، خورشید طلعت، ستارہ حشم سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ چونکہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندوستان خصوصاً اس شہر (دہلی) میں آئیں ان کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے۔ اس بنا پر اس والاشکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ جو تہنیت فتح اور خیر مقدم نوروز پر مشتمل تھا اور ۱۹ر فروری کو جمعہ کے دن بہ ذریعہ ڈاک بھیجا۔

۲۰ر فروری۔ خبر فتح لکھنؤ

۲۰ر فروری کو شام کے وقت ۲۱ دیو آواز، نہنگ آہنگ توپوں کی آواز آئی اور اتوار کی صبح کو شہر لکھنؤ کی فتح کی خوش خبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی کہ ۱۶ر فروری کو آسمان سروری کے اختر تابندہ، سپہ سالار نام ور کمانڈر انچیف بہادر نے سیاہ رو، جنگ جو (باغیوں) پر اس طرح حملہ کیا کہ آسمان کے سپہ سالار (مریخ) نے سلامت دست و بازو کی اتنی دعائیں دیں اور اس قدر تعریف کی کہ اس کے ہونٹوں پر بتنجالے پڑ گئے اور زبان تھک گئی۔

دنیا کو آبادی کا مژدہ، اور اہلِ دنیا کو نوید آزادی! کہ آزاد اور نیک ذات لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہو گئی اور بُرے اور بد ذات

لوگوں کا دور دورہ وہاں بھی ختم ہو گیا۔ پھر سننے میں آیا کہ توپوں (کی گرج) اور شہنائیوں کے نغمے (صرف) حصول طاقت کے شادیانے تھے۔ فتح نصیب فوج کے بہادر اس جنگ کے دوران میں شہر پر قابض نہیں ہوئے (بلکہ) دلیروں کی طرح دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے دوڑ پڑے (دشمنوں کو زخمی اور قتل کرنے کے بعد (اپنے) پڑاؤ کی طرف لوٹ آئے۔

۲۴ فروری - آمد چیف کمشنر

۲۴ فروری کو بدھ کے دن ایک پہر دن چڑھے مبارک وقت میں باغِ انصاف کے سرو آزاد آسمانِ رفعت کے ماہِ تابندہ، فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، ستارہ حشم چیف کمشنر بہادر نے اپنے توسن کے سموں کے نشانات سے دہلی کی سرزمین کو آسمان کی طرح ستارہ زار بنا دیا۔ اور تیرہ توپوں کی (سلامی کی) آواز نے خستہ دلوں کو مرہم مہر و محبت کی بشارت دی۔ ؎

حاکم شاہ نشاں (کیا) آئے کہ شہر کے (مردہ) جسم میں روح واپس آگئی

شہر میں مسرت کی ایسی (لہر) دوڑ گئی ہے جیسے (شہنشاہ) شاہ جہاں آگئے ہوں۔

۲۷ر فروری

۲۷ر فروری کو جب سنیچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی۔ رات کے تین پہر گزر گئے (اس وقت) مظلوموں کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح چھا گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلا اُٹھے کہ چاند گہن میں آگیا۔ اسی سنیچر کو حکم دور بار ختم ہوگیا۔ انصاف چاہنے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے کی اجازت اور خواہش مندوں کو پناہ دے دی گئی۔

بے شمار لوگوں کو پھانسی

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرونِ شہر۔ ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے (ان محدود مقامات میں کثرتِ تعداد کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمایا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے ان کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دُور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سرزمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ

لوگ شہر کے ارد گرد دو دو، چار چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشین گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہش مند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتہ دار ہیں یا خیرات خوار یعنی پنشن دار ہیں۔ لوگوں کی درخواستوں میں رہائی، آبادی یا اجرائے پنشن کے علاوہ اور کوئی (مضمون) نہیں پاؤ گے۔ داد خواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ گئی ہیں۔ یہ انصاف طلب چشم براہ اور گوش برآواز ہیں کہ کیا سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔

۸ / مارچ

میں بھی اس نیاز نامے اور ستائش نامے کے جواب کا منتظر ہوں جس کو میں نے بہ ذریعہ ڈاک بھیجا تھا۔ مختلف خیالاتِ پریشاں کے سبب سے حاکم (شہر) کی جائے قیام پر جانے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے۔ مختصر یہ کہ (ہر اعتبار سے) ایسی مصیبتیں ہیں گویا (ہر طرف) کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اگر باہر نکلو گے تو راستے میں (بچھے ہوئے) دیکھو گے۔ اگر گھر (ہی) میں بیٹھے رہو گے (تو معلوم ہوگا) کہ کپڑوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ (کسی طرح سکون نہیں ہے) ابھی تک

صبر بے تابی پر غالب تھا کہ ۸ مارچ کو پیر کے دن وہ خط ایک تحریر کے ساتھ میرے پاس واپس آ گیا۔ خط کی پیشانی حاکم دانش آموز کے اس فرمان سے منور تھی کہ خط فرستندہ کو واپس کر دیا جائے تاکہ وہ حاکم شہر کے توسط سے ہمارے پاس بھیجے۔ سب نے کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ پُر فائدہ جواب امید افزا علامت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری (گزارشات) منظور ہو جائیں گی۔ وہ خط جس پر فرمان مسطور تھا۔ مناسب عبارت کے اضافے کے ساتھ سرور عادل رعایا پرور، دانش مند، چارلس ساؤنڈرس صاحب چیف کمشنر بہادر کے حضور میں بھیجا اور ایک خط خاص طور پر نام موصوف (چارلس ساؤنڈرس) کے نام منسلک کر دیا۔ جو خواہش دیرینہ یعنی اجرائے پنشن سے متعلق تھا۔

۱۷ مارچ

۱۷ مارچ کو بدھ کے دن فرماں روا کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا کہ یہ خط جس میں تہنیت کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایسے پُر آشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرت و انبساط کی کیا گنجائش۔ میں تو بندۂ شکم ہوں۔ مجھ کو تو روٹی چاہیے۔ دیکھوں تو اس دوسری خواہش کے بارے میں کیا

حکم ہوتا ہے۔

۱۸ مارچ ۔ فتح لکھنؤ

۱۸ مارچ کو جمعہ کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی آواز توپ آسمان کے نیلے گنبد میں گونج اٹھی۔ (جس سے) لکھنؤ کا فتح ہونا اور اس شہر میں کینہ خواہ انگریزی فوج کا حسب دلخواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل، دروازہ کچھ نہیں ہے۔ یقیناً وہاں کے (باغیوں) کی فوج کی دیوار اس طرف کے بہادروں (انگریزوں) کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوشش کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو بایقین سواروں اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد وغبار بلند ہوا ہوگا۔ ہاں خدا اپنے فضل سے جس کو بادشاہت عطا کرتا ہے اس کو فتح کرنے کی طاقت اور شان وشوکت بھی عطا کرتا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص فرماں رواؤں کی نافرمانی کرتا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے سر پر جوتے لگیں۔ محکوم کا حاکم سے لڑنا (ستالی) پر ہاتھ مارنا (اپنے آپ کو تباہ کرنا) ہے۔ دنیا والوں کے لیے مناسب ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے خوش بختی عطا کی ہے ان کے سامنے سر جھکا دیں اور فرماں رواؤں کے حکم کی تعمیل خدا کے حکم کی تعمیل سمجھیں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہوگیا کہ خوش نصیبی، حکومت اور

طاقت کس کی بخشی ہوئی ہے تو پھر سرکشی اور بیزاری کیوں ہے نغمہ طرازِ شیراز (سعدی) نے اس بات کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے۔ ؎

غلام (آقا کے) حکم کے سامنے سر نہیں جھکائے گا تو کیا کرے گا۔ گیند
چوگان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے۔

۲۲ مارچ سے مجھ دیوانے کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ دنیا میں فروردین کا مہینہ اور نوروز کا دن بھی آتا تھا اور وہ روز جہاں افروز (نوروز) انھیں دو چار تاریخوں میں ہوتا تھا۔ امسال شاید یہ شہر مُردوں کا مسکن ہے کہ بہار کی آمد آمد پر نعرہ ہائے مسرت بننے میں نہیں آتے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ سال ترکوں کے "سال دوازدہ گانہ" میں سے کون سا سال ہے۔ اور رات دن کے برابر ہونے کی ساعت کب آئے گی۔ اگر منجم مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (آفتاب) کے سفر کا روزنامچہ تحریر (پیش گوئی آثار) سے خالی رہ گیا تو یہ سمجھو کہ چند جھوٹ بولنے والے کم ہو گئے اور یہ فرض کرلو کہ چند جھوٹی باتیں سُنی ہی نہیں۔ آفتاب برج حمل میں قیام (تحویل) کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ نہ اُگے اور پھول نہ کھلیں۔ اصولِ آفرینش بدلتے نہیں ہیں۔ آسمان مقررہ اصول گردش کے خلاف عمل نہیں کرسکتا۔

میں باغ پر نہیں اپنے اوپر آنسو بہا رہا ہوں۔ مجھے موسم بہار کی کوئی

شکایت نہیں ہے اپنی بدقسمتی کا شکوہ کر رہا ہوں۔ سے

دنیا لالہ کے پھولوں سے رنگین اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے معطر
ہے لیکن میں ایک گوشے میں مجبور و بے سروساماں بیٹھا ہوا ہوں۔
بہار کا موسم ہے اور میں بالکل بے سروساماں ہوں۔ مفلسی کے سبب
سے گھر کا دروازہ بند ہے۔

روانگی حکیم محمود خاں

میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ زمانہ بہت بے پروا ہے۔ میں زاویہ نشین غم و الم اگر سبزہ و گل کو نہیں دیکھوں گا اور دماغ کو پھولوں کی خوشبو سے معطر نہیں کروں گا تو بہار میں کیا کمی آ جائے گی اور ہوا سے کون تاوان لے گا؟

اپریل کے مہینے میں تیس دن میں دو ثلث ماہ فروردیں کے اور ایک ثلث ماہ اردی کا ہے۔ حکیم محمود خاں کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنا راستہ لیا۔ وہ ناز پروردہ، صاف طینت (حکیم محمود خاں) سارے رشتہ داروں، بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیالے کی طرف چلا گیا۔ کہتے ہیں ابھی تک کرنال میں وہ مقیم ہیں۔ معلوم نہیں آئندہ کے لیے کیا سوچا ہے۔

فتح مراد آباد

مئی کے شروع میں کانوں کو یہ خبر سننے کا فخر حاصل ہوا کہ سپاہ کینہ خواہ بہادروں نے مراد آباد کو فتح کر لیا۔ جو بد اندیش (باغیوں) کی گزرگاہ تھا اور اس شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لیے عالی نسب، سرچشمۂ علم و دانش نواب یوسف علی خاں بہادر کے حوالے کر دیا۔ آج کل (نواب یوسف علی خاں) جو دنیا کو فتح کرنے اور دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہیں اس علاقے پر بہ تعمیل حکم کے طور پر فرماں روائی کر رہے ہیں (اور مجھ کو) امید ہے کہ ہمیشہ فرماں روائی کرتے رہیں گے۔

فتح بریلی

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ کوہ شگاف اور اژدھا شکار فوج نے جب (بریلی و مراد آباد کے) اس علاقے پر یورش کی تو بریلی کے گناہگار (باغیوں) کو اس طرح نکال باہر کیا جیسے طاقت ور موجیں خس و خاشاک کو کنارے پر پھینک دیتی ہیں۔ اس صورتِ حال (کو دیکھتے ہوئے) توقع ہے کہ جو گمراہ جان (باغی) ادھر ادھر باقی رہ گئے ہیں، شہروں، گاؤں میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور راستہ چلنے والوں کو ستاتے ہیں۔ ان کا دور دورہ

بھی جلد ختم ہو جائے گا اور سارا ملک حاکمانِ عادل (انگریز) کے پرچم کے زیر سایہ آجائے گا۔

۱۳؍جون۔ احوال بہادر جنگ خاں

۱۳؍ جون کو اتوار کے دن شام کے وقت حاکمِ شہر نے بہادر جنگ خاں کو اپنے پاس بلایا۔ جو قلعہ میں نظر بند تھے وہ بڑی امیدوں کے ساتھ گئے جاں بخشی اور ایک ہزار ماہانہ وظیفہ (مقرر کیے جانے) کی خوش خبری سنائی گئی اور حکم ہوا کہ لاہور کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کی زندگی بسر ہو گی اور اسی شہر (لاہور) میں رہنا ہو گا۔ بے شک ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ وہ (بہادر جنگ خاں) جاہ و دولت کے غم و افسوس سے آزاد ہو جائیں اور اس آزادی پر مسرور و مطمئن ہوں۔

فتح گوالیار

دن کا شہنشاہ (آفتاب) جس کا سر روزانہ نیزے پر گھمایا جاتا ہے ابھی افق مشرق سے بہ قدر یک نیزہ بلند نہیں ہوا تھا کہ ماہ جون کے گزرے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر رعد کی طرح گرجنے والی توپوں کی آواز بلند ہوئی (۲۱ ضرب توپ سے مراد ہے) جس نے دوستوں کے دلوں کو مسرت

وشادمانی سے معمور کر دیا اور آگ سے زیادہ جلانے والی (غم کی) راکھ دشمنوں کے سر اور چہرے پر ڈال دی۔ گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور سنگین قلعہ کے ہاتھ آجانے کی خوش خبری جو زمین کا جگر گوشہ اور پہاڑ کا لختِ جگر ہے، خدا کے دربار سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لائی۔ (اس مژدۂ پُر مسرت نے) حاکموں اور فرماں برداروں کو آرزوؤں کا چراغ جل اٹھنے (آرزوئیں پوری ہو جانے) کی بشارت دی۔

یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ فرماں روائے گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ حکومت اور شہر دونوں کو چھوڑ کر آگرے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی (انگریزوں سے) امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی (باغیوں نے) بھاگم بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رُخ کیا تھا، یہاں ایسی شکستِ فاش ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ان گمراہوں کا انجام یہ ہوگا کہ بدحالی و پژمردگی کے ساتھ اِدھر اُدھر لوٹ مار کرتے پھریں گے۔ اور آخر کار جگہ جگہ ذلت و خواری کے ساتھ مارے جائیں گے۔ ان کے صحرانورد گھوڑوں کو بے آب و گیاہ میدانوں میں زمین پر پڑا ہوا (مردہ) دیکھو گے اور اس گروہ کے ساز و سامان کو گزرگاہوں میں بکھرا ہوا پاؤ گے۔ پھر ہندوستان خس و خار (ظلم و ستم) سے ایسا پاک ہو جائے گا کہ جنگل کا ہر گوشہ باغ کی طرح سرسبز ہوگا اور ہر رہ گزر بازار کی طرح پُر رونق نظر

آئے گی۔

راقم الحروف کی زندگی کے تر گذشتہ سال گذر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے روح فرسا غموں (کے سبب) سے ظاہر ہے کہ اب زمانے سے اور زیادہ زیست (عمر) کی توقع بے جا ہے۔ مجبوراً سحر نگار شیراز (سعدی) رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کو دہراتا ہوں اور جس طرح ایک غم نصیب دوسرے غم زدہ شخص سے نصیحت حاصل کرتا ہے ان اشعار (کو پڑھ کر) اگر دل کو خوش نہیں کرسکتا ہوں تو کم سے کم قید رنج وغم سے آزاد تو کر ہی لوں گا۔ ؎

افسوس! ہمارے بغیر اس دنیا میں بارہا بہاریں آئیں گی اور پھول کھلیں گے۔ تیر دے اور اردی بہشت کے مہینے بار بار آئیں گے۔

جب کہ ہم (قبر میں) خاک ہو چکے ہوں گے۔

فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے میں نیم مسلمان مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی ورسوائی کے رنج ڈر سے بے نیاز۔ ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی۔ ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جب کہ انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں اگر خدا دوست، خدا شناس، فیاض، دریا دل مہیش داس دیسی شراب قند جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بو میں اس سے بڑھ کر ہے بھیج کر آتش دل

کو سرد نہ کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا اسی عالم جگر تشنگی میں مر جاتا ؎

عرصے سے دل چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آرزو پوری ہو جائے (آرزو یہ تھی کہ) شراب ناب کے ایک دو ساغر مل جائیں۔ دانش مند مہیش داس نے مجھ کو وہ آب (حیات) بخش دیا جس کو سکندر نے اپنے لیے ڈھونڈھا تھا۔

یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نیکی پسند شخص (مہیش داس) نے (شہر میں) مسلمانوں کی آباد کاری کے متعلق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی چونکہ خدا کی مرضی نہیں تھی۔ کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ (شہر میں) ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہربان حاکموں کی محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس نیکی پسند بہی خواہ (مہیش داس) کا اس انتظام میں دخل رہا ہے۔ قصہ مختصر خوش نصیب شخص ہے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ زندگی عیش و مسرت کے ساتھ گزارتا ہے۔ اگرچہ مجھ سے پرانی شناسائی نہیں ہے۔ اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔

ہندو شاگردوں اور دوستوں کی امداد کا اعتراف

میرے دوسرے متعلقین اور شاگردوں میں سے ہیرا سنگھ جو ایک

نیک نام نوجوان اور تعلقات کا بہت خیال رکھنے والا ہے، (برابر) آتا رہتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد نصف ویران شہر کے لوگوں میں سے عالی نسب شیو جی رام برہمن، جو ایک عقل مند نوجوان ہے اور مجھ کو بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ مجھ درویشِ غم زدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے۔ فرماں برداری اور کارسازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا لڑکا بال مکند جو ایک پرہیزگار اور خوش اخلاق نوجوان ہے۔ اپنے والد کی طرح تعمیلِ حکم میں مستعد اور غم گساری میں یکتا ہے۔

دور دراز کے دوستوں میں سے (ایک دوست) آسمانِ محبت کے ماہِ کامل شیوا بیان، ہر گوپال تفتہ (بھی ہیں)۔ جو میرے پرانے مونس و ہمدم ہیں اور اس بنا پر کہ مجھ کو اپنا استاد کہتے ہیں ان کا کلام ساری خداداد خوبیوں کے ساتھ میرے لیے سرمایۂ ناز ہے۔ مختصر یہ کہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ سرتاپا محبت و اخلاص۔ شاعری سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دم سے شاعری کے ہنگامے گرم رہتے ہیں۔ انتہائے محبت سے میں نے ان کو اپنا جزو روح سمجھ لیا ہے "مرزا تفتہ" خطاب دیا ہے۔ انھوں نے میرٹھ سے ایک ہنڈی میرے پاس بھیجی۔ نیز غزل اور خط برابر بھیجتے رہتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا لکھنا لازمی نہیں تھا، صرف اس لیے لکھیں کہ

(ان لوگوں کی) فیاضی اور محبت کا شکریہ ادا ہو جائے۔ نیز اس لیے بھی (لکھیں) کہ جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ یہ سمجھ لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں، اور دن میں دیواروں کے روزن روشنی سے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے۔ اس تنہائی میں قلم کے سوا اس کا ہم زبان اور (اپنے) سایہ کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے۔ ؎

اب میرے چہرے پر اس وقت تک آب ورنگ نہیں آتا جب تک کہ ہزار بار اشک خوں سے چہرے کو تر نہ کروں۔ میرے جسم میں غم و افسوس جان و دل بن گئے ہیں اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے (تیار ہوا) ہے۔

گھر کی تباہی

اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا (گردش) روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس لوٹ مار میں جب کہ شہر کے کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی۔ اگرچہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا (لیکن) میں قسم کھا سکتا ہوں

کہ بستر اور پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔ اس عقدۂ دشوار کا حل اور اس دروغ نما سچ کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں (باغیوں) نے شہر پر قبضہ کیا۔ بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں، زیور، وغیرہ جو کچھ تھا خفیہ طور پر کالے صاحب پیر زادہ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں تہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

جب فاتح (انگریزوں) نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم مل گیا تب بیگم نے یہ راز مجھ سے کہا۔ وقت نکل چکا تھا (وہاں تک جانے اور (سامان) لانے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں۔ اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔

تنگ دستی و مجبوری

اب یہ جولائی کا پندرھواں مہینہ ہے۔ قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے (ملتی تھی) اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہیں نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب (بیچ کر) کھاؤں گا عالم برہنگی میں بھوک سے مر جاؤں گا۔

اس قیامت میں یہ پُرانے نوکروں میں سے دو تین، نوکر میرے پاس سے نہیں گئے۔ ان کی بھی پرورش کرنا ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آدمی آدمی کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ نوکر کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس گروہ (ملازمین) کے علاوہ دوسرے ضرورت مند جو ہمیشہ سے مجھ سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں اس بُرے وقت میں بھی اپنی روح فرسا اور از سوال سے مرغ کی صدائے بے ہنگام سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اب جب کہ جسمانی تکلیفوں کے دباؤ اور روحانی اذیتوں کی لذت آگہی نے جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے۔ یکایک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کو آراستہ کرنے میں (جس کا نام تصنیف ہے) کب تک مشغول رہا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس کش مکش کا انجام یا تو موت ہے یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو گا کہ یہ داستان ہمیشہ کے لیے انجام و اختتام سے محروم رہے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو افسردہ کرے۔

دوسری صورت (یہ بات) ظاہر ہے کہ اس ساری داستان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا کہ فلاں گلی سے سر بازار دھتکار دیا گیا اور فلاں دروازے پر کچھ مل گیا۔ پھر یہ باتیں کب بیان کی جا سکتی ہیں اور

اپنے آپ کو (کہاں تک) رسوا کیا جاسکتا ہے۔ باقی پنشن اگر مل گئی تب بھی آئینہ (دل) سے زنگ (غم) صاف نہیں ہوسکے گا (قرض ادا نہیں ہوگا) اگر نہیں ملی، اس صورت میں شیشہ پتھر سے چور چور ہوجائے گا۔ (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چوں کہ یہاں (دہلی) کی آب و ہوا مصیبت زدہ لوگوں کو سازگار نہیں آتی ہے۔ یقیناً شہر سے بھاگنا ہوگا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہوگا۔

تفصیل وقائع دستنبو

مئی سال گزشتہ سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔ یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش میری ان تین خواہشوں یعنی خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انھیں کی طرف لگا ہوا ہے وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے، آسمان جس کا تخت ہے، جمشید نشان، فریدوں فر، کاؤس مرتبہ، سنجر شکوہ، سکندر حشم، وہ شہنشاہ کہ شاہ روم اس بات کے لیے اس کا شکر گزار ہے کہ اس کے تخت و تاج کی عزت رہ گئی۔ فرماں روائے

روس کا دل اس کی لشکرکشی کے خوف سے دو نیم ہے۔ آفتاب اس خیال
سے کہ (یہ) جہاں سوزی اس کی ناراضی کا سبب ہے اگر ڈرتا نہیں ہے
تو وہ پھر کیوں ہر لمحہ کانپتا رہتا ہے اور ماہِ کامل اس اندیشے سے کہ دنیا
کو منور کرنے میں اس کی برابری کا احتمال ہے اگر اپنی گستاخی کی معافی
نہیں چاہتا ہے تو پھر کیوں ہر رات خوف سے گھٹتا رہتا ہے۔ ؎

وہ مالک تیغ و نگین و علم ہے۔ وہ شہنشاہ سلطنت بخش اور بادشاہ ساز
ہے۔ صاحب دانش، فرخ طلعت اور نیک خو ہے۔ اس کا مرتبہ انصاف
میں نوشیرواں سے بلند تر ہے۔ جمشید کے پاس جو درخشاں علم تھا وہ
اس لیے اس کو حفاظت سے رکھتا تھا کہ اس ملکۂ نام ور کے سپرد کر دے۔
خسرو کی طرف سے ترنج زر اور اس کے ساتوں خزانے بغیر زحمت
اٹھائے ہوئے ملکہ کو بہ طور تحفہ ملے ہیں۔
وہ تخت (سلیمانؑ) جس کو ہوا اپنے کاندھوں پر لے جاتی تھی۔ فرشتۂ
غیب نے ملکہ کے سامنے بہ طور پیش کش پیش کیا ہے۔
تم نہیں دیکھتے ہو کہ پہاڑوں میں پتھروں کے جگر سے گوہر رنگا رنگ
برآمد ہوتے ہیں۔
سورج کو اس کے تاج کا خیال رہتا ہے۔ ورنہ اسے موتیوں سے کیا
کام۔

اگر وہ (ملکہ وکٹوریہ) موتی لٹانے کا ارادہ کریں اور لٹائیں تو (کثرتِ بخشش سے یہ حالت ہوگی کہ) اگر کوئی شخص ان موتیوں کو شمار کرنا چاہے گا تو شمار کرتے کرتے اس کی انگلیاں گھس جائیں گی۔

اس کی فوج کے خوف سے جو لڑائی کے وقت دریاؤں اور پہاڑوں کو تباہ کر دیتی ہے، پہاڑوں میں اژدھے اور دریاؤں میں نہنگ سر پٹک کر مر جائیں گے۔

اس کی شان و شوکت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ (اس کے در کے) گدا ہیں۔

اس کی ضیا بخشی اور کرم بے دریغ کا یہ فیض ہے کہ یہ سورج روشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے۔

وہ کرم و فیاضی سے اہل علم و دانش کو نوازتی ہیں اور ان کی دانشمندی کی برکت سے دوسرے لوگ صاحب خرد ہو جاتے ہیں۔

ان کی سخاوت حیرت آفریں ہے اور ان کی عقل رسا۔ ان کا نام ملکۂ عالم وکٹوریہ ہے۔

خدائے پاک ان کا نگہبان رہے (خدا کرے) اس محفل ہستی میں ان کا قیام دیر تک رہے۔

اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس ... اسے

ناکام نہیں جاؤں گا۔ ؎

جب بات یہاں تک آپہنچی تو میں خاموش ہوگیا۔ میں داستان کہنا
نہیں چاہتا ہوں۔

مکمل ہونے کے بعد اس کتاب کا نام دستنبو رکھا گیا (یہ کتاب) لوگوں کو دی گئی اور ادھر ادھر بھیجی گئی تاکہ صاحبانِ علم و دانش کی روح کو تسکین بخشے۔ اور انشاء پرداز (اندازِ نگارش پر) فریفتہ ہوجائیں۔ امید ہے کہ یہ مجموعۂ دانش (دستنبو) انصاف پسند لوگوں کے ہاتھوں میں گلدستۂ پر رنگ و بو ہوگا اور شیطان فطرت لوگوں کی نگاہوں میں آتشیں گیند۔ آمین ؎

ہماری طبیعت جو ہمیشہ رواں رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم رازہائے
آسمانی کا سرچشمہ ہیں۔ یہ کتاب دساتیر ہی کا ایک حصّہ ہے۔ اس
کاردانی کے بِرانداسے (گویا) ہم ساسان ششم ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

بنات النعش



مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

صفحات: 151

قیمت: -/78 روپے

ارباب نثر اردو

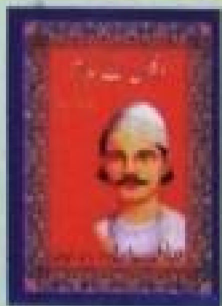


مصنف: سید محمد

صفحات: 247

قیمت: -/77 روپے

انیس کے سلام

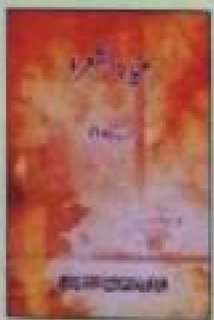


مرتبہ: علی جواد زیدی

صفحات: 307

قیمت: -/60 روپے

عیارالشعراء



مصنف: خوب چند ذکا

صفحات: 805

قیمت: -/200

خسرو شناسی



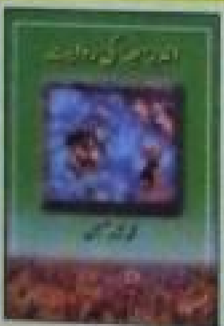
مرتبین: ظ۔ انصاری

ابوالفیض سحر

صفحات: 368

قیمت: -/81 روپے

اندر سبھا کی روایت



مرتب: محمد شاہد حسین

صفحات: 343

قیمت: -/140 روپے

ISBN : 978-81-7587-720-7

9 788175 877207

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025